© rasailojaraid.com

تزکیۂ نفس

دین میں تزکیۂ نفس کی اہمیت اور اس کی عمومی ضرورت

(مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد اگر یہ سوال کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کا اصلی مقصود کیا ہے؟ وہ کیا غرض ہے جس کے لیے اس نے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا اور شریعت اور کتابیں نازل فرمائیں؟ تو اس کا صحیح جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ـــــ نفوس انسانی کا تزکیہ ـــــ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے جو دعا فرمائی ہے اس میں آپ کی بعثت کی اصلی غایت یہی بیان فرمائی ہے کہ آپ لوگوں کا تزکیہ کریں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (بقرہ - ۱۲۹)

اے ہمارے رب! تو ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مطابق جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت اور اس کے مقاصد کا حوالہ ان الفاظ میں دیا۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ (بقرہ - ۱۵۱)

چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول تمہی میں سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح سورہ جمعہ میں آپ کی بعثت اور اس کے اغراض و مقاصد کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل پر ان الفاظ میں احسان جتایا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔

وہی خدا ہے جس نے اُمّیوں (بنی اسمٰعیل) میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور بے شک اس سے پہلے وہ نہایت کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں جہاں تزکیہ کا ذکر آیا ہے وہاں تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت کا بھی ذکر آیا ہے تو ہم نے آپ کی یا انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد صرف تزکیہ کو کیسے قرار دے دیا؟ آخر دوسری چیزیں بھی تو اسی اہمیت کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں، وہ کیوں اصلی مقصد قرار پانے کی مستحق نہیں ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید کے اسلوب بیان نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ مذکورہ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی مقصدِ بعثت کی حیثیت سے جس چیز کا ذکر ہوا ہے وہ تزکیہ ہی ہے باقی اس کے ساتھ دوسری چیزیں ——— تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت ——— جو مذکور ہوئی ہیں تو وہ اصلی مقصد کی حیثیت سے نہیں بلکہ اصلی مقصد کے وسائل و ذرائع کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورہ بقرہ کی مذکورۂ بالا دونوں آیتوں میں سے ایک آیت (آیت ۱۲۹) میں تزکیہ کا لفظ سب کے آخر میں آیا ہے اور دوسری آیت (آیت ۱۵۱) میں سب کے شروع میں آیا ہے۔ ایک غور کرنے والا شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہی بات کے بیان کرنے میں اسلوب کا یہ رد و بدل کم از کم قرآن مجید میں بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ اب غور کیجیے کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ہماری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اس تقدیم و تاخیر سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نبی کی تمام جد و جہد اور اس کی تمام سرگرمیوں کا محور و مقصود در اصل تزکیہ ہی ہے۔ کیونکہ اصل مقصد ہی کی یہ اہمیت ہوتی ہے کہ وہ شروع میں بھی ایک کام کرنے والے کے پیش نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی۔ وہی اس کی تمام سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز بھی ہوتا ہے اور وہی نقطۂ اختتام بھی۔ وہیں سے وہ اپنا سفر شروع بھی کرتا ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہیں اس کو ختم بھی کرتا ہے۔

کسی اسکیم کے اندر جو چیز مقصدی اہمیت کی حامل ہوتی ہے وہ عمل میں اگرچہ موخر ہوتی ہے لیکن ارادہ اور خیال میں مقدم ہوتی ہے۔ آپ ایک مکان کی تعمیر سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ سکونت کی راحت ہے اور یہ چیز عین اس وقت آپ کے سامنے ہوتی ہے جبکہ آپ ایک مکان کا نقشہ ابھی کاغذ کے صفحہ پر بنا رہے ہوتے ہیں حالانکہ عملاً یہ چیز حاصل اس وقت ہوتی ہے جبکہ مکان بن چکتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو مکان کی تعمیر سے جو اصل مقصد ہے (یعنی سکونت کی راحت)، وہ شروع میں بھی آپ کے پیش نظر ہے اور آخر میں بھی پیش نظر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شروع میں آپ نے اس کو فکراً اور ارادۃً سامنے رکھا ہے اور آخر میں نتیجۃً۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ ایک مکان کی تعمیر کے لیے پہلی اینٹ زمین پر جماتے ہوئے بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس سے سکونت کی لذت و راحت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس وقت بھی کہہ سکتے ہیں جبکہ تمام مراحل تعمیر سے گذر کر اس کے کرنے کی آخری اینٹ بھی رکھی جا چکی ہو کیونکہ درحقیقت یہی چیز ہے جو آپ کی تمام تعمیری سرگرمیوں میں شروع سے آخر تک پیش نظر رہی ہے۔ ظاہر ہیں آپ نے پھاوڑے بھی چلائے، اینٹیں بھی پکائیں، آرے بھی چلائے، چونا اور گارا بھی فراہم کیا، دیواریں بھی چنیں اور چھتیں بھی پاٹیں لیکن ان میں سے کوئی چیز فی نفسہٖ آپ کا مقصود نہیں رہی ہے۔ اس تمام کھکیڑ سے اصلی مقصد درحقیقت آپ کا یہ تھا کہ آپ کو سکونت کی آسائش حاصل ہو۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر اگر آپ انبیاء کی بعثت کے مقصد کو سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا اصلی مقصد تو لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی ہوتا ہے اور اسی نقطہ سے وہ اپنی تمام دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا آغاز کرتے ہیں لیکن اس مقصد کی خاطر انہیں بہت سے ایسے دوسرے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جو اس مقصد کے حصول کا وسیلہ و ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کے لیے وہ اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے لیے وہ کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ حکمت کا درس دیتے ہیں، مگر مقصود ان سارے کاموں سے صرف تزکیہ ہوتا ہے جو شروع میں بھی ان کے پیش نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی وہی ان کی تمام جدوجہد کی غایت بنتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے مذکورہ بالا آیات میں سے ایک آیت میں اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تمام سرگرمیوں کے نقطۂ آغاز کی حیثیت سے نمایاں کیا ہے اور دوسری آیت میں اس کی غایت اور منتہا کی حیثیت سے
علاوہ ازیں قرآن مجید میں اس بات کی بھی صاف صاف تصریح موجود ہے کہ تزکیہ ہی وہ اصلی کام ہے جس کے لیے لوگوں کو نبی کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور نبی کا فرض ہے کہ جو لوگ اس غرض کے لیے اس کی طرف رجوع کریں ان کو ہرگز مایوس نہ کرے۔ چنانچہ ایک موقع پر بعض اسباب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طالب تزکیہ کے معاملہ میں تھوڑی سی غفلت ہو گئی تو اس پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مندرجۂ ذیل الفاظ الفاظ میں تنبیہ فرمائی گئی:-

عَبَسَ وَتَوَلّٰی، اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی وَ — اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ اس کے پاس نابینا آیا
مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰی۔ (عبس) — اور تمہیں کیا خبر؟ شاید وہ تزکیہ حاصل کرنے آیا ہو۔

اس آیت سے بالکل صاف واضح ہو رہا ہے کہ نبی خلق خدا کی جس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے وہ ان کے نفوس کا تزکیہ ہے، اس وجہ سے لوگوں کو یہ حق ہے کہ اس غرض کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔ اور اس کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ لوگوں کی اس ضرورت کو پورا کرے۔

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کا تزکیہ قرار دیا گیا ہے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا بھی اصلی مقصد اسی چیز کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی فَقُلْ — فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اور اس سے
هَلْ لَّكَ اِلٰٓی اَنْ تَزَكّٰی۔ (۱۷-۱۸- نازعات) — کہو کہ ہے تیرے اندر کچھ رغبت کہ تو تزکیہ حاصل کرے۔

پھر یہ حقیقت بھی قرآن مجید سے ثابت ہے کہ تزکیہ ہر شخص کی فلاح و نجات آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ تزکیہ کی یہ اہمیت بھی تقاضا کرتی ہے کہ یہی چیز انبیاء کی بعثت کی غایت اور ان کی تمام سرگرمیوں کا محور و مقصد قرار پائے۔ چنانچہ قرآن مجید اس بات پر شاہد ہے کہ آخرت میں انسان کی نجات و فلاح منحصر ہے تمام تر اس بات پر کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔ فرمایا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ — اس نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور وہ
مَنْ دَسّٰهَا۔ (شمس) — نامراد ہوا جس نے اس کی گندگیوں پر پردہ ڈالا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح دوسری جگہ ہے۔

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی (الاعلیٰ) اس نے فلاح پائی جس نے تزکیہ حاصل کیا۔

ظاہر ہے کہ جب آخرت میں انسان کی نجات و فلاح تزکیہ حاصل کرنے پر منحصر ہوئی تو انبیاء علیہم السلام کا، جو انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اصلی کام یہی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کریں، اور اُن کو تزکیہ حاصل کرنے کے طریقے بتائیں۔

اوپر کے مباحث سے تین باتیں واضح ہوئیں ایک یہ کہ تزکیہ تمام دین و شریعت کی غایت اور تمام انبیائؑ کی بعثت کا اصلی مقصود ہے۔ دین میں جو اہمیت اس چیز کو حاصل ہے وہ اہمیت دوسری کسی چیز کو بھی حاصل نہیں ہے۔ دوسری ساری چیزیں وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ چیز غایت و مقصد کی حیثیت رکھتی ہے انبیاء علیہم السلام کی تمام سرگرمیاں، خواہ ظاہر میں کتنے ہی مختلف پہلو کیوں نہ رکھتی ہوں لیکن باطن میں ان کا ہدف انسان اور انسانی معاشرہ کے تزکیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ تزکیہ کا سرچشمہ اور اس کا منبع و مصدر کتاب اللہ ہے۔ اسی کی تعلیم سے تزکیہ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اسی کے اسرار و حقائق ہیں جو نبی کے ذریعہ سے واضح ہو کر اس تزکیہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی نکتہ ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ جمعہ کی جو آیتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں ان میں تزکیہ کو تلاوت آیات کے ساتھ اس طرح وابستہ کیا ہے کہ یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ تزکیہ درحقیقت تلاوت آیات ہی کے ثمرات و نتائج میں سے ہے۔ یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ (تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے) یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیۡھِمۡ (ان کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے)

تیسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ تزکیہ کا عمل انسانی معاشرہ کے کسی خاص گروہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام افراد اور تمام گروہوں بلکہ پورے معاشرہ سے یکساں طور پر ہے۔ کوئی شخص بھی اس کے بغیر آخرت میں نجات اور فلاح نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کی حیثیت دین میں صرف ایک فضیلت کی نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لیے ایک ناگزیر انفرادی ضرورت کی ہے۔ یہ نجات اور فلاح آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے جس کو پورا کیے بغیر کوئی شخص بھی جنت میں نہیں داخل ہو سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تزکیہ کا علم نہ راز ہو سکتا ہے نہ نامکمل

اگر یہ تینوں باتیں اپنی جگہ پر ثابت ہیں (اور کوئی شخص بھی ان کے ثابت ہونے سے انکار نہیں کر سکتا) تو ان سے دو نتیجے لازمی طور پر نکلتے ہیں۔

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تزکیہ کے علم کو نامکمل چھوڑ کر دنیا سے تشریف نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تزکیہ کو آپ کے مقاصدِ بعثت میں محض ایک ضمنی جگہ حاصل نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا اصل مقصدِ بعثت یہی ہے۔ پھر جو چیز اصل مقصدِ بعثت ہو اس کو پیغمبر نا تمام اور ناقص چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟ تزکیہ کی اس اہمیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح شریعت کے تمام اصول کتاب و سنت کے اندر منضبط کر دیے گئے ہیں اسی طرح تزکیہ کے تمام اصول بھی کتاب و سنت کے اندر منضبط ہوں جس طرح شریعت کے اندر کسی بے راہ روی کے لیے گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی کسی بے راہ روی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ جس طرح شریعت کے اندر ایک خاص دائرہ میں اجتہاد کی آزادی کے باوجود کسی شخص کو اس بات کا موقع حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے ذوق یا اپنے ذاتی رجحانات یا اپنے شخصی تجربات کو اس کے اندر گھسا دے اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی ایک خاص دائرہ میں اجتہاد کی آزادی کے باوجود ایسی حد بندیاں ہونی چاہئیں کہ اشخاص و افراد کے اپنے میلانات و رجحانات کی دراندازیوں کے لیے کوئی منفذ باقی نہ رہے۔ جس طرح شریعت کے اندر ہر مجتہد اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کو کتاب و سنت ہی کے اشارات کی کسوٹی پر پرکھتا اور پرکھواتا ہے اور اس کے بغیر اس کا کوئی اجتہاد بھی لائق قبول نہیں ٹھہرتا، اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی اگر کوئی شخص کوئی بات اپنے اجتہاد سے کہے تو اس کے لیے ناگزیر ہو کہ وہ کتاب و سنت کے اشارات اور نبیؐ اور صحابہؓ کے طرزِ عمل سے کوئی دلیل لائے، محض اپنے ذوق و وجدان کا حوالہ نہ دے، ورنہ اس کے اجتہاد کا کوئی وزن نہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تزکیہ کا علم کوئی راز نہیں ہو سکتا جو صرف خاص خاص اشخاص ہی کو معلوم ہو اور انہی سے سینہ بسینہ وہ دوسروں کو منتقل ہو۔ تزکیہ ایک عام ضرورت کی چیز ہے۔ ہر شخص آخرت کی نجات و فلاح کے لیے اس کا محتاج ہے۔ انبیاء آتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ افراد کا بھی تزکیہ کریں اور معاشرہ کا بھی تزکیہ کریں۔ پھر جو چیز اس قدر عوامی ضرورت کی ہو اس کو صرف چند خاص خاص افراد کے سینہ کا راز بنا کے کس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح چھوڑا جا سکتا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص ہر علم کا اہل نہیں ہوتا اس وجہ سے اگر کوئی شخص اس علم کا ذوق رکھنے والا نہ ہوگا تو وہ اس سے محروم رہیگا۔ علیٰ ہذا القیاس اہل علم میں فرق مراتب بھی ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے سارے جاننے والے ایک درجے کے نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ کوئی "پر اسرار" علم ہے جس کے جاننے والے صحابہؓ کے زمانہ میں بھی چند ہی افراد تھے اور بعد میں بھی خال خال افراد ہی ہوئے۔ جو چیز ہوا اور پانی کی طرح ہر شخص کے لیے ضروری ہو یہ کس طرح ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بس ایک دو آدمیوں کے کانوں میں پھونک کر چلے جائیں، دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہونے پائے۔ اور یہ دو ایک آدمی بھی اس کو عام کرنے کے بجائے اس کو راز بنا کے رکھ چھوڑیں اور صرف انہی اشخاص پر اس راز کو کھولیں جو ان کے محرم راز بن جائیں۔ علم کیمیا کی تعلیم میں تو یہ رازداری چل سکتی ہے لیکن تزکیہ اگر عام ضرورت کی چیز ہے جیسا کہ اس کی عام ضرورت کی چیز ہونے سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے، تو اس میں اس رازداری کا چلنا نہ ممکن ہے اور نہ قرین مصلحت۔ ہمارے حنفی علماء عام ضرورت کی چیزوں میں عموماً خبرِ احاد کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس چیز کا تعلق عام ضرورت سے ہے اس کے بارہ میں ایک ہی دو طریقوں سے روایت کے کیا معنی؟ لیکن یہی حضرات جب تصوف کے کوچہ میں آتے ہیں تو تزکیہ کے علم کو ایک راز ثابت کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اِن باتوں کو اہلِ ظاہر کیا جانیں، یہ اسرار و مواجید ہیں"۔ وہ اس فخر کے نشہ میں اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ اگر تصوف کا منشا تزکیۂ نفس ہے تو تزکیۂ نفس تو ایک عام ضرورت کی چیز ہے پھر ایک عام ضرورت کا تقاضا ایک ایسے علم سے کیسے پورا ہو سکتا ہے جو صرف چند سینوں کا ایک راز ہو؟

بعض احادیث سے غلط استدلال | جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے وہ نتائج نہایت بدیہی طور پر نکلتے ہیں جو ہم نے نکالے ہیں اور عقل عام بھی انہی کی تائید کرتی ہے لیکن ہمارے اہل تصوف حضرات اس علم کو ایک "پر اسرار" علم ثابت کرنے پر نہایت مصر ہیں۔ وہ اپنے اس دعوے پر جہاں بہت سے مشائخ تصوف کے اقوال سے دلیل لاتے ہیں وہاں بعض احادیث اور بعض آثار بھی پیش کرتے ہیں۔ مشائخ تصوف کے اقوال و ارشادات سے تو یہاں بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن جن احادیث و آثار سے انہوں نے استدلال کیا ہے ان کی حقیقت واضح کرنا ہمارے لیے ضروری ہے ورنہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں کھٹک باقی ہی رہیگی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان حضرات کا سب سے بڑا استدلال حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت سے ہے جو بخاری شریف میں حسب ذیل الفاظ میں وارد ہے۔

عن ابی هریرۃ قال حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعائین فاما احدهما فبثثتہ فیکم واما الاخر فلو بثثتہ لقطع هذا البلعوم (بخاری)

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو ظرف اکٹھے کیے تھے ایک ظرف کا علم تو میں نے تمہارے اندر پھیلا دیا۔ رہا دوسرا ظرف تو اگر اس کے علم کو میں تمہارے اندر پھیلاؤں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی۔

اس حدیث سے یہ حضرات ثابت کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کردہ ایک ایسا ذخیرۂ علم بھی تھا جس کی حیثیت بالکل ایک سرِ مخفی کی تھی جس کے حقائق اور باریکیوں کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہ تھا بلکہ صرف خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے تھے۔ یہ علم ان حضرات کے خیال کے مطابق جمہور کے فہم اور ان کے مذاق و رجحان سے اس قدر مختلف بلکہ اس کے مخالف تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ ڈرتے تھے کہ اگر اس علم سے وہ پردہ اٹھا دیں تو لوگ ان کو جیتا نہ چھوڑیں۔

یہ نتائج نکال کر ان سے جو اثر یہ حضرات پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ ان نتائج سے بھی زیادہ اہم اور دوررس ہے۔ ان کی آڑ لے کر یہ حضرات تصوف اور ائمہ تصوف کی ان ساری باتوں کو عین دین ثابت کرنا چاہتے ہیں جن کا کتاب و سنت سے کوئی جوڑ نہیں لگتا اور جن پر اہلِ حق ہمیشہ نکیر کرتے رہے ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ اہلِ تصوف کے اسرار و کشوف کے لیے دین میں بڑی گنجائش نکل آتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ علمِ دین صرف اتنا ہی نہیں ہے جتنا قرآن و حدیث میں نظر آتا ہے بلکہ علمِ دین کا بہت بڑا حصہ عوام کے اندیشوں سے خواص کے سینوں ہی میں محفوظ رہا اور اگر آں سے منتقل ہوا بھی تو صرف خواص ہی تک محدود رہا، عام اہلِ علم کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے پائی۔ عام اہلِ علم جنہوں نے قرآن و حدیث کے الفاظ و کلمات کے واسطہ سے دین کو سیکھا ہے وہ تو صرف علم بالاحکام کے وارث ہوئے ہیں۔ اصلی علم تو علم باللہ ہے اور اس کی وراثت صرف ان لوگوں کو

[1] اس کی مثالیں مناسب مواقع پر اس سلسلۂ مباحث میں آئیں گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منتقل ہوتی ہے جنہوں نے اس علم سینہ میں سے حصہ پایا ہے۔

یہاں سے یہ حضرات ایک قدم اور آگے بڑھا دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اہلِ حقیقت اور اہلِ ظاہر کے معیارات بالکل الگ الگ ہیں، اس وجہ سے ایک کی باتوں کو دوسرے کی کسوٹیوں پر جانچنا اصولی طور پر غلط ہے۔ اہلِ ظاہر جو کچھ کہتے ہیں وہ الفاظ کو دیکھ کر کہتے ہیں اور اہلِ حقیقت کی نگاہیں معانی کی رازداں ہوتی ہیں ع

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے یہ اثرات جو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خاصے سنگین ہیں اور ان کی زد پوری شریعت پر پڑتی ہے اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ ہم اس کا صحیح مطلب واضح کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے نزدیک حضرت ابو ہریرہؓ کے اس قول کے تین پہلو ہو سکتے ہیں۔

ایک پہلو تو یہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کو جب یہ باتیں بتائی ہوں تو ساتھ ہی ان کو یہ ہدایت بھی فرما دی ہو کہ یہ دوسروں کو بتانے کی نہیں ہیں بلکہ پوشیدہ رکھنے کی ہیں، اگر تم نے ان کو ظاہر کیا تو یہ اندیشہ ہے کہ تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں بطور راز کے تو نہ بتائی ہوں بلکہ تعلیم و تبلیغ ہی کے لیے بتائی ہوں لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی زندگی ہی میں ماحول اس قدر بدل چکا ہو کہ وہ باتیں لوگوں کے لیے بالکل اوپری بن کے رہ گئی ہوں اور ان کو پیش کرنا پیش کرنے والے کے لیے خطرہ سے خالی نہ رہ گیا ہو۔

تیسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ باتیں ایسی ہوں جن کے بیان و اظہار میں وقت کے اربابِ اقتدار اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں اس وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کو اندیشہ ہو کہ اگر وہ باتیں وہ بیان کرنی شروع کر دیں تو وقت کے اربابِ اقتدار کے ہاتھوں اُن کی جان کی خیر نہ رہے۔

اب عقل و نقل اور روایت و درایت سے ان تینوں پہلوؤں کو جانچیے اور پرکھیے کہ ان میں سے کون سا پہلو واضح نظر آتا ہے۔

(۱) ان میں سے پہلی صورت تو بداہتہً غلط معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ اس طرح کی پراسرار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باتوں کا کوئی ذخیرہ آنحضرت صلعم کو محفوظ ہی کرنا ہوتا تو اس امانت کے لیے موزوں ترین فقہا صحابہ میں سے کسی کا ہو سکتا تھا جو فہم و فقاہت اور راز دار دین ہونے کے لحاظ سے تمام صحابہ میں ممتاز تھے۔ اس کے لیے موزوں شخص حضرت ابوبکرؓ ہو سکتے تھے، حضرت عمرؓ ہو سکتے تھے، حضرت علیؓ ہو سکتے تھے، حضرت عثمانؓ ہو سکتے تھے، حضرت زید بن ثابتؓ ہو سکتے تھے، حضرت معاذ بن جبلؓ ہو سکتے تھے، حضرت ابو الدرداءؓ ہو سکتے تھے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ ہو سکتی تھیں۔ یہ لوگ صحابہ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے اور دین و شریعت کی باریکیوں کے سمجھنے اور مختلف چیزوں کے مدارج و مراتب کے امتیاز میں نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ اس وجہ سے بجا طور پر اس علم کے حامل اور امین ہونے کے زیادہ اہل تھے جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ع

بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

حضرت ابوہریرہؓ کا ایک محدث اور ایک کثیر الروایۃ صحابی ہونے کی حیثیت سے جو درجہ ہے اس سے کسی کو مجال انکار نہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ دین کی باریکیاں سمجھنے میں ان کا وہ مرتبہ نہیں ہے جو طبقۂ اول کے صحابہ کا ہے۔ اور اس حقیقت کو نبی صلعم سے زیادہ جاننے پہچاننے والا اور کون ہو سکتا ہے!

دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جو تعلیم و تلقین بھی فرمائی وہ چھپانے اور راز رکھنے کے لیے نہیں بلکہ سیکھنے اور سکھانے کے لیے ہی فرمائی۔ ہمیں قرآن یا حدیث میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس سے آنحضرت صلعم کی زندگی میں یا دوسرے انبیاء کی زندگی میں اس قسم کی صوفیانہ رازداری کا پتہ چلتا ہو۔ خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بار بار صحابہؓ کو اس بات کی تاکید فرمائی کہ وہ جو کچھ آپ کی صحبت میں سنیں اور دیکھیں اس کو دوسروں کو بتائیں آپ نے فرمایا کہ میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میرے منہ سے جو کچھ سنو اس کو محفوظ کر لو کیونکہ میرے منہ سے کوئی بات غلط نہیں نکلتی۔ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سامعین کو یہ ہدایت فرمائی کہ جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو یہ ساری باتیں بتائیں جو موجود نہیں ہیں کیونکہ بہت سے لوگ دوسروں سے سن کر براہ راست سننے والوں سے زیادہ محفوظ رکھتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ حق بات جانتے ہوئے دوسروں کو اس کے بتانے سے گریز کریں گے قیامت کے دن ان کے منہ میں آگ کی لگام لگائی جائے گی اس طرح کی متعدد تاکیدات مختلف پہلوؤں سے ہمیں احادیث میں آپ کی طرف سے ملتی ہیں لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ آپ نے کسی ایک صحابی سے بھی کوئی بات فرمائی ہو اور پھر یہ تاکید کی ہو کہ اس کو اپنے ہی تک راز رکھنا، دوسروں پر اس کو نہ کھولنا، ورنہ لوگ تمہاری جان کے دشمن بن جائیں گے۔ اس کے برخلاف بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ آپ نے کوئی بات بتائی ہے اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرمائی ہے کہ اس کو بتانا اور کہنا اگرچہ اس کے سبب سے لوگ تمہارے دشمن ہی بن جائیں اور تمہیں نقصان ہی پہنچائیں۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی زندگیوں ہی میں نہیں بلکہ دوسرے انبیاء اور ان کے صحابہ کی زندگیوں میں بھی ہمیں اس طرح کی ہدایات و تاکیدات کم و بیش انہی الفاظ میں ملتی ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے ایک مرتبہ اپنے شاگردوں کو کچھ ہدایات دیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ لوگ ان باتوں کے سبب سے تمہیں بازاروں میں کوڑے لگائیں گے اور عدالتوں میں مجرم ٹھہرائیں گے مگر تم ان باتوں کی پروا نہ کرنا۔ تمہارا آسمانی باپ تمہارے ساتھ ہے۔

(۲) اب دوسری صورت کو لیجیے۔ یعنی اس بات کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں حضرت ابوہریرہؓ کو سکھائی اور بتائی تو ہوں تبلیغ و تعلیم کے عام مقصد ہی کے تحت لیکن حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی ہی میں لوگوں کے حالات اس قدر متغیر ہو چکے ہوں کہ اب ان باتوں کو بتانا اور سکھانا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی ہی میں زمانہ کے حالات بہت کچھ بدل چکے تھے۔ ان کی وفات خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد بنی امیہ کی حکومت کے زمانہ میں ہوئی ہے جبکہ مسلمانوں کے اندر طلب دین کا جوش سرد پڑ رہا تھا اور طلب دنیا کی سرگرمیاں اس کی جگہ پر غالب آنی شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن اس انقلاب حال کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنی امیہ کے دور میں (کم از کم شروع میں) عوام کا مزاج اس قدر نہیں بگڑا تھا کہ لوگ دین کی باتوں سے اس درجہ نامانوس اور بیگانہ ہو جائیں کہ ان کو پیغمبر کی حدیثیں سنانا بھی ایک پرخطر کام بن جائے۔ اس دور میں جلیل القدر صحابہؓ کا ایک گروہ موجود تھا، ان کے شاگرد لوگ بھی ہر جگہ موجود تھے، ان کا اعزاز و احترام بھی اچھا خاصا لوگوں میں پایا جاتا تھا، احادیث کے نقل و روایت کی گرما گرمی بھی ہر جگہ موجود تھی۔ بہت سی خرابیوں کے پیدا ہو جانے کے باوجود بھی فضا ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی کہ دین کی باتوں کو بتانا اور سکھانا دشوار ہو جائے۔ اس دور میں عجمی تمدن اور عجمی علوم کا گھن بھی طبائع کو نہیں لگا تھا کہ لوگ اس فطری سادگی اور دلکشی سے بالکل ہی نامانوس ہو جائیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اقوال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں پائی جاتی تھی۔ ذہنی اعتبار سے لوگ کچھ متغیر ضرور ہو گئے تھے لیکن اتنے پست نہیں ہو گئے تھے کہ ان میں اسلامی باتوں کے سمجھنے یا اسلامی اقدار کے احترام کی صلاحیت ہی سرے سے باقی نہ رہ گئی ہو۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں دین کی سادہ اور عام تعلیمات کے سمجھنے والے بھی موجود تھے اور دین کی گہری باتیں سمجھنے والے بھی ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ دین کی گہری باتوں کے سمجھنے کے اہل جس طرح ہر دور میں تھوڑے پائے گئے ہیں اسی طرح اس دور میں بھی ان کی تعداد تھوڑی تھی۔ پس یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت ابوہریرہؓ نے محض عوام کے فسادِ مذاق کے سبب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے علم کو ظاہر کرنے سے اپنے آپ کو بے بس اور مجبور محسوس کیا ہو۔

(۳) اب رہ گئی تیسری صورت یعنی حضرت ابوہریرہؓ کا یہ ذخیرۂ علم ایسی حدیثوں پر مشتمل ہو جن کے نقل و روایت اور جن کے پھیلنے میں وقت کے اربابِ اقتدار اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں۔

ہم کو یہی بات قرینِ قیاس اور عقل و نقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ نے بنو امیہ کا دور اور مروان اور امرائے مروان کا جور دیکھا تھا۔ ان کی وفات ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں ہوئی ہے جبکہ مسلمان بنو امیہ کے استبداد کے شکنجہ میں اچھی طرح کسے جا چکے تھے اور بنو امیہ تلوار کے زور سے ان تمام اہلِ حق کے دبا دینے کے درپے تھے جو ان کے استبداد اور ان کی سیاسی و اجتماعی بدعتوں کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے ذخیرۂ علم میں ایسی بہت سی حدیثیں تھیں جن میں اسلامی امراء و حکام کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں یا جن میں بنو امیہ کے دور کے فتنوں، ان کے "ملک عضوض" (استبداد) اور ان کے "چھوکروں" کی ستم رانیوں اور ان کے ہاتھوں دین اور اہلِ دین کی بربادی کی بابت حضور نے پیشین گوئیاں فرمائی تھیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے اس قسم کی روایات کے ذخیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں روزہ و نماز اور حج و زکوٰۃ کی حدیثوں کی طرح اجتماعی و سیاسی معاملات سے متعلق حدیثیں بھی کھلم کھلا بیان کرنا شروع کر دوں تو مستبدین وقت مجھے جیتا نہ چھوڑیں گے۔[1]

---

[1] حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول کا مطلب تو بلاشبہ یہی ہے لیکن اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس طرح جان کے اندیشہ سے صحابہؓ نے رسولؐ کے دیے ہوئے علم کے ایک بڑے حصہ کو ضائع کر دیا اور وہ امت کی طرف منتقل (باقی ص ۳۵۱ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت ابوہریرہؓ کے قول کا یہ مطلب عقل و نقل اور روایت و درایت کے بالکل مطابق معلوم ہوتا ہے اور صرف مَیں نے ہی اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا ہے بلکہ دوسرے شارحین حدیث بھی اس مطلب کی طرف گئے ہیں۔ چنانچہ لمعات میں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے۔

وقیل اراد به اخبار الفتن وفساد الدین علی یدا غیلمة من قریش وکان ابو هریرة یکنی عن بعض ولا یصرح به خوفاً علی نفسه کقوله اعوذ باللّٰہ من امارة الصبیان یشیر الی امارة یزید بن معاویة۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے حضرت ابوہریرہؓ کا اشارہ ان احادیث کی طرف ہے جو فتنوں سے متعلق ہیں اور جن میں قریش (بنوامیہ) کے چھوکروں کے ہاتھوں دین کی بربادی کی پیشین گوئیاں ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ ان میں سے بعض کی طرف اپنے اقوال اور دعاؤں میں اشارہ بھی کرتے تھے لیکن اندیشۂ جان کے سبب سے نام لے کر ان کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہا کرتے تھے "میں چھوکروں کی امارت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں" اور اس سے ان کا اشارہ یزید بن معاویہ کی امارت کی طرف ہوتا تھا۔

دوسری حدیث جس سے یہ حضرات اپنے باطنی علم کی تائید میں استدلال کرتے ہیں وہ عبداللہ بن مسعودؓ سے ان الفاظ میں مروی ہے۔

عن ابن مسعود قال لی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم انزل القرآن علی سبعة احرف لکل اٰیة منها ظهر وبطن۔ الحدیث

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ قرآن سات قرأتوں پر نازل ہوا ہے اور ان میں سے ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۳) ہونے ہی سے رہ گیا۔ حضرت ابوہریرہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ان روایات کو سرے سے بیان ہی نہیں کرتے بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ ان چیزوں کے بیان کرنے میں محتاط ہو گئے ہیں، ان کو آزادی کے ساتھ کھلم کھلا نہیں بیان کرتے فتنہ کے اندیشہ سے صحابہؓ اس طرح کی باتوں کو صرف اپنے اہل اور لائق شاگردوں سے بیان کرتے تھے۔ ان کے ذریعہ سے ان کا علم بعد والوں کو منتقل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی حدیثوں کی شہرت پہلے دور میں نہیں ہوئی بلکہ دوسرے یا تیسرے دور میں ہوئی۔ لیکن بہرحال علم رسول ضائع نہیں ہوا بلکہ اسلاف سے اخلاف تک منتقل ہو گیا اور یہی ہمارے سلف صالحین کی ذمہ داری تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی حدیث کے ہم معنی حضرت عبداللہ بن عباس کا ایک قول بھی ہے جس میں انہوں نے قرآن کے ایک دریائے معانی ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن ایک دریائے معانی ہے۔ قرآن کے عجائب کبھی ختم نہیں ہونگے۔ قرآن میں تمام علم اولین اور تمام علم آخرین ہے۔ قرآن کی تازگی پر کبھی باسی پن نہیں آئے گا۔ قرآن سے اہل علم کبھی آسودہ نہیں ہونگے یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر حقیقت ہیں اور ان لوگوں سے منقول ہیں جو قرآن کے رازداں رہے ہیں لیکن اس مضمون کی احادیث و آثار اور اس کے ہم معنی اقوال و اشارات سے یہ استدلال کرنا کہ قرآن نے ایک ایسا علم باطن بھی دیا ہے جس کے حامل ہر دور میں صرف چند نفوس قدسیہ ہی رہے ہیں اور انہی کے ذریعہ سے یہ علم ہر دور کے مخصوص حاملین کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے، ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے لیکن اس کا کوئی باطن نہیں جس کی طرف رہنمائی خود اس کا ظاہر نہ کرے۔ قرآن کے اندر اسرارِ حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن ہی کے الفاظ و اشارات ہیں، قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں ہے۔ قرآن کے علوم کا ایک حصہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، ایک حصہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے، ایک بہت بڑا حصہ اس کے سیاق وسباق سے بے نقاب ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے۔ جو لوگ قرآن پر تدبر کرتے ہیں وہ بقدر استعداد اس سے فیض پاتے ہیں اور وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق و نظام سے دلیل لاتے ہیں۔ اس معاملہ میں مجرد ذوق یا کشف یا مشاہدہ کو دلیلِ راہ نہیں بناتے۔ ایک فقیہ جس طرح قرآن حکیم سے ایک فقہی حکم مستنبط کرتا ہے اور اس پر قرآن کے الفاظ یا اشارات سے کوئی دلیل پیش کرتا ہے اور اگر وہ اس طرح کی دلیل نہ پیش کرے تو اس کی بات بالکل بے وزن ہو کے رہ جاتی ہے، اسی طرح ایک "صاحب اسرار" کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہر بستر پہ، جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے قرآن سے سمجھا ہے، قرآن سے دلیل لائے، اور اگر وہ قرآن سے دلیل نہ لا سکے تو اس کے اس نکتہ کی کوئی وقعت نہیں اگرچہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس نے یہ نکتہ خانہ کعبہ کے اندر قرآن کی روحانیت کی طرف توجہ کے ذریعہ سے حاصل کیا ہے[1]۔

[1] اس قسم کے اسرار کی دلچسپ مثالیں ہم آگے چل کر پیش کرینگے۔

© rasailojaraid.com

پس جہاں تک قرآن کے اندر اسرار و حِکَم کے موجود ہونے کا تعلق ہے اس سے کسی کو بھی انکار کی مجال نہیں ہے لیکن اسرار و حِکَم کے اس خزانہ پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اس خزانہ میں سے بقدرِ صلاحیت و استعداد وہ لوگ حصہ پاتے ہیں جو لوگ کتاب الٰہی پر تدبر کرتے ہیں اور ان شرائط کے ماتحت تدبر کرتے ہیں جو قرآن پر تدبر کے لیے مقرر ہیں۔ حضرات صوفیائے کرام نے جو اسرار و معارف دریافت کیے ہیں ان کا وہ حصہ بے شک صحیح ہے جو انہوں نے قرآن کے تدبر کے ذریعہ سے حاصل کیا ہے اور جس پر وہ قرآن سے کوئی دلیل رکھتے ہیں مگر مجرد اس بنا پر کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے علم باطن کا ایک پورا انبار کھڑا کر دینا اور اس کی حمایت میں مذکورہ بالا حدیثوں سے دلیل لانا صریح زیادتی ہے۔

باطن نماز کا بھی ہے، باطن روزہ کا بھی ہے، باطن حج کا بھی ہے، باطن زکوٰۃ کا بھی ہے۔ اور قرآن نے صاف صاف اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان میں سے ہر چیز کا ایک باطن ہے اور وہی باطن مقصود حقیقی ہے لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ کوئی شخص اٹھ کر ان عبادات کی ساری صورت و ہیئت بالکل بدل ڈالے اور جب کوئی شخص اس پر اعتراض کرے تو وہ یہ جواب دے کہ یہ باتیں باطن سے تعلق رکھنے والی ہیں، ان کو اہل ظاہر کیا جانیں۔ قرآن نے جہاں یہ بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ظاہر کا ایک باطن ہے وہیں یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ فلاں ظاہر کا باطن یہ ہے، کہ کسی بے راہ روی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

ایک ضروری گذارش

ناظرین ترجمان میں سے بعض حضرات مدیر ترجمان سے بعض مسائل و استفسارات دریافت کرتے ہیں اور خطوط میں اپنا مکمل پتہ لکھنے کے بجائے ترجمان میں جواب کی اشاعت کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن اس طرح کے تمام خطوط کا جواب رسالے میں دیا جانا نہ ممکن ہے اور نہ ہی ضروری اور مناسب ہوتا ہے۔ عدم اشاعت کی صورت میں ان جوابات کا براہ راست بھیجا بھی ناممکن ہو جاتا ہے اس لیے اس طرح کی خط و کتابت کرنے والے جملہ اصحاب سے درخواست ہے کہ وہ پورا پتہ تحریر فرمایا کریں تاکہ اگر جواب ترجمان میں دیا جانا ممکن نہ ہو تو ڈاک سے دیا جا سکے۔

© rasailojaraid.com